وزیر آغا

کُوزے بھرنے لگتے ہیں!

لفظ کا برتن خالی ہو
تو کتنا شور مچاتا ہے
بھاری بوجھل آوازوں کی
ڈھولک سی بن جاتا ہے
بھر جائے
تو اُس کے دَر پر
پیاسی یادیں، بنجر سُپنے
ننگے بچّے
اپنے اپنے کُوزے لے کر آجاتے ہیں
تب اُس کی آوازیں
ممتا آجاتی ہے
دھیمی لَے
اِک دُودھ کی چھاگل بَن جاتی ہے
شہد بھرے کتنے ہی معانی
ٹَپ ٹَپ گرنے لگتے ہیں
دھیرے دھیرے
کُوزے بھرنے لگتے ہیں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیکھ دھنک پھیل گئی

دیکھ دھنک پھیل گئی

وزیر آغا

کاغذی پیرہن

دیکھ دھنک پھیل گئی (شاعری نظمیں) ...... وزیر آغا

وسیم جگنو نے مکتبۂ جدید پریس، لاہور، سے چھپوا کر
کاغذی پیرہن، ۷۲ بیڈن روڈ، لاہور، سے شائع کی۔

اشاعتِ اوّل : مئی ۲۰۰۳ء
مشینی خطاطی : ورڈ میکرز
سرورق : ریاظ
قیمت : ۱۰۰ روپے

Dekh Dhanak Phail Gai
(*Urdu* Poetry by *Wazir Agha*)

Printed by:
Maktaba-e-Jadeed Press,
9 Railway Road, Lahore, Pakistan.

Price:
Pakistan: Rs.100.00, Abroad: US$. 7.00, UK Pound. 5.00

Cover Design: *Riaz* / Layout: *Wordmakers*

Published by:
Kaghadhi Paerahen
72 Beadon Road, Lahore-54000, Pakistan.
Tel: +92-42-7122552
email: kaghadhipaerahen@hotmail.com

ISBN 969-8527-40-0

فاختہ کے نام

فاختہ، دیکھ دھنک پھیل گئی!
رنگ برسے زرِ پَر سے کیا کیا

شاہد شیدائی

دیکھ دھنک پھیل گئی

تکوین

اِکتارے کے تار پہ تُو نے
ہلکے نرم دباؤ سے
جس سُر ندیا کو چھیڑ دیا تھا
وہ اَب صَوت سمندر بَن کر
پھیل چکی ہے،
بَل کھاتی لہروں میں ڈھل کر
رقص ہُوئی ہے،
ایک مہا ساگر سے جیسے

لاکھوں ہاتھ نکل آئے ہوں
جلتی بجھتی پوروں سے
ساحل کو چھُو کر دیکھ رہے ہوں
لیکن ہم بے خبرے، ہمیں تو
اِتنا بھی معلوم نہیں ہے
انت، بے انت سُروں کے
اِس موّاج مہا ساگر کی تہہ میں
اِکتارے کا وُہی اکیلا تار
ابھی تک لرز رہا ہے
جس کو تیری
مخروطی اُنگلی کی پور نے
چھیڑ دیا تھا!

☆☆☆

آنسو بھری مُسکان

بس اِک
آنسو بھری مُسکان ہے
جس کے سہارے جی رہے ہیں
وگرنہ چھت پہ کنکر بھی گرے
تو اِک دھماکہ
سارے تن کو کپکپی کا دان دیتا ہے!
سحر دم دُودھیا اَخبار کے پرتوں
کے ٹکرانے سے

خبریں، پتّیاں بن بن کے گِرتی ہیں
"تبرک" مُٹھیوں میں بھر کے
خالی جھولیوں میں دَم بہ دَم
تقسیم کرتی ہیں
ہَوا جھونکوں میں بَٹ کر
شہر کی گلیوں میں
ہم کو ڈُھونڈنے نکلی ہُوئی ہے
مقفّل کھِڑکیوں پر دستکیں دیتی
ہماری کھوج میں پاگل ہُوئی ہے
نہ جانے کس جگہ ہم آ گئے ہیں
جہاں خوشیاں
زدِ جارُوب کھاتی پھر رہی ہیں!
بس اِک آنسو بھری مُسکان ہے
جس کے سہارے جی رہے ہیں!!

☆☆☆

کتنی مُشکل سے!

تھکن
آنکھوں کی بھاری چلمنوں سے
لگ کے بیٹھی
دُھندا وڑھے منظروں کو
دیکھتی...... کب دیکھتی ہے!
جھکی شاخوں سے چمٹے
سبز پتّے
سکڑتی نلکیاں بن کر

ندی پر جھک گئے ہیں
ندی کا تہہ نشیں پانی
زمیں کی کوکھ میں ٹھہرا ہُوا ہے
فلک...... اِک گول برتن
خاک پر اوندھا پڑا ہے
سلوموشن میں ہر شے آ گئی ہے
تپائی سے میں خود کو
کتنی مُشکل سے
صُراحی کی نمی تک لے کے جاتا ہُوں
مگر پھر لَوٹنا میرے مقدّر میں نہیں ہوتا!

☆☆☆

آخر آخر میں

آخر آخر میں
بس ایک پُرانی کشتی باقی رہ جاتی ہے
جس میں اِک پانی کی چھاگل
اِک باسی روٹی کے ٹکڑے
اور اِک جلی ہُوئی پتوار
کے ساتھ سفر کرنا پڑتا ہے
اِک ایسا بے نام سفر

جو ساحل کی موہوم لکیر کے
نام سے بھی گھبراتا ہے
بس اپنے ہی محور پر گھومتا جاتا ہے!

☆☆☆

نہ جانے کیوں نہیں آئی !

خموشی

ہاتھ میں کاسہ لیے
رستے میں بیٹھی ہے
کوئی سکّہ گرے کاسے میں
اور ٹھن کی صدا آئے
خموشی سوچتی ہے......
مگر چاروں طرف چُپ کا
تسلسل بیکراں ہے

تھکے قدموں کی مدھم چاپ
لہراتی ہَوا کی سرسراہٹ
اوِر کبوتر کے پَروں کی گُم صدا
......کچھ بھی نہیں ہے !
مہکتی اَن کہی اِک بات
آنا تھا جسے اِک دن
وہ اَب تک آ نہیں پائی
نہ جانے کیوں نہیں آئی !

خموشی ہاتھ میں کاسہ لیے
رستے میں بیٹھی ہے !!

کسی کسی دِن!

کسی کسی دِن
بھُولے سے جب خوشی مِرے گھر
آتی ہے
غم کو جانے کیسے اُس کے آنے کی
فی الفوَر خبر ہو جاتی ہَے
خالی کیسوں، زخموں، درزوں
اور درازوں میں بکھرا غم
یک دَم یکجا ہو جاتا ہَے

پہلے اُس کا تن بنتا ہے
پھر تَن پر اِک چہرہ جیسے اُگ آتا ہے
چہرے سے دو خونیں آنکھیں
جُڑ جاتی ہیں
مجھ کو حصار میں لے لیتی ہیں
اپنی شعاؤں کی چھَینی سے مجھ کو
ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں
اَور خوشی
وہ گڑیا سی اِک نازک لڑکی
وہ تو اِتنا ڈر جاتی ہے
میرے گھر کے
اندھے اوِر سُنسان کنوئیں میں
کُود کے جان بچاتی ہے!

☆☆☆

کُوزے بھرنے لگتے ہیں!

لفظ کا برتن خالی ہو
تو کتنا شور مچاتا ہے
بھاری بوجھل آوازوں کی
ڈھولک سی بن جاتا ہے
بھر جائے
تو اُس کے دَر پر
پیاسی یادیں، بنجر سپنے
ننگے بچّے

اپنے اپنے کُوزے لے کر آجاتے ہیں
تب اُس کی آواز میں
ممتا آجاتی ہے
دھیمی لَے
اِک دُودھ کی چھاگل بَن جاتی ہے
شہد بھرے کتنے ہی معانی
ٹَپ ٹَپ گرنے لگتے ہیں
دھیرے دھیرے
کُوزے بھرنے لگتے ہیں!

☆☆☆

چہرہ

کبھی کبھی جب بادل اوڑھے
ٹھنڈی ٹھار ہَوا آتی ہے
اَور میں
گُنجل اُون کی بھاری تہہ کے نیچے
دَب جاتا ہُوں
اپنے جسم کی گرم گپھا میں
گم ہوتا ہُوں
مجھ کو' اپنے اندر

ایک ہُجُوم دکھائی دیتا ہے

بے چہرہ لوگوں کا ایک ہجوم

جو بَل کھاتا' لہراتا' کتنے

رنگ بدلتا پھرتا ہے

......ایک عجیب سا

کثرت اور تفریق کا منظر......

جیسے چاروں جانب

دھبّوں والی دُھند بچھی ہو!

تب اُس دُھند کے کینوس پر

اِک چہرہ

جو صدہا چہروں کا

ایک عجیب مرکّب ہے

آنکھیں پھاڑے

مجھ کو تکنے لگتا ہے

جیسے مِرے چہرے کی

ہر دھجّی میں اپنا چہرہ ڈھونڈ رہا ہو!

☆☆☆

اِک کف بھری پُھنکار

عجب دِن تھے
صبا رفتار گھوڑے پر
کبھی جب ہم، سفر کرتے
تو یوں لگتا
کہ راکِب اور مرکَب میں
دوئی کا شائبہ تک بھی نہیں ہے
مگر جب سے
ہمیں تُو نے پُرانی، سال خُوردہ
چرچراتی ایک بگھی میں

سفر کرنا سکھایا ہے
صبا رفتار گھوڑے کو
ہمارے بس بھرے سُوجے بدن
ڈھونے کے مشکل کام پر
تُو نے لگایا ہے
تو یُوں لگتا ہے جیسے
بَٹ گئے ہم
دو زمانوں
دو ٹھکانوں میں
ہمارے درمیاں
چمڑے کے چابک کا
چمکتا خم
اُتر آیا کھنچی تلوار کی صُورت
ہَوا دو نیم ہو کر گر پڑی ہے
نمی آنکھوں کے پردوں پر جمی ہے
ہمیں اِک کف بھری پُھنکار کھینچے جا رہی ہے!

☆☆☆

اُسے آنا تو ہے اِک دِن !

اُسے آنا تو ہے اِک دِن
سو آجائے
دبے قدموں مگر آئے
ہَوا جیسے خزاں کی کترنوں کو
چُھو کے آتی ہے
سیہ بادل کا ہرکارہ
اچانک جیسے اُجلے آسماں پر
دعوتی خط ہاتھ میں لے کر

ہَوا پر تیرتا آئے

معا جیسے

اگربتّی کی خَم کھائی ہُوئی خوشبو

کسی گھر کے مقفّل دَر سے لگ کر

ایک پَل ٹھہرے

مگر پھر دَر کی دَرزوں سے

گزر کر

گھر کے اندر

بِن بُلائے اجنبی مہمان کی صُورت

چلی آئے

اُسے آنا تو ہے اِک دِن

سو آجائے!

☆☆☆

جی مانے تو چُپکے سے تم!

اِن میری بھیگی آنکھوں میں تم رہنا سیکھو
کن بے آب جہانوں میں تم
سرگرداں ہو
پانی کی اِک بُوند کی خاطِر
صحراؤں کو چھان رہے ہو
کہاں ملے گی تم کو وُہ اِک بُوند
جسے سُورج نے پَل میں
جھپٹ لیا تھا

خاک کِیا تھا

لہُو کی بُوند اگر ہوتی وُہ

اُڑ جاتی پر اپنا سُرخ نشان

زمیں پر چھوڑ کے جاتی

پانی کی ہر بُوند تو بس

اُڑنے کے لیے یاں آتی ہے

تم اِس کا نشان کہاں ڈھونڈو گے

جی مانے تو چُپکے سے

بس میری بھیگی آنکھوں میں اِک بار

لپک کر آ جاؤ

پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے!

☆☆☆

ہَوا ناراض تھی شاید!

ہَوا ناراض تھی شاید
نہ اُس نے بات کی ہم سے
نہ اپنے ساتھ چلنے کو کہا'
اندھی گلی کے موڑ پر رُک کر
ہمیں بس اِک نظر دیکھا
مگر پھر موڑ کاٹا اوِر بہت سے
راستوں سے ایک رَستہ
چُن لیا اُس نے

جو قصبے کے دُھواں آلُود
گہرے حاشیے کی سمت جاتا تھا
جہاں اِک ریل گاڑی
منتظر تھی اُس کے آنے کی!

ہَوا ناراض تھی شاید
بہت جلدی تھی اُس کو
ریل کا پلُو پکڑ کر
دُور جانے کی
دما دَم پیچھے ہٹتی پٹڑیوں میں
جذب ہونے کی!!

☆☆☆

بلیک ہول

دِکھائی وہ نہیں دیتا
سُنائی......؟
سُنائی بھی نہیں دیتا
مگر ہالہ سا اُس کے گِرد
جانے کس نے کھینچا ہے
وُہ ہالہ
جس کے اُوپر اِک عجب کُہرام ہے
بنتی بگڑتی صُورتوں کا

عجب دیوانگی ہے
جس نے پروانوں کی صُورت
آتشیں تاروں کو
ہالے کی کُنہ میں
غرق ہو جانا سکھایا ہے
عجب گہراؤ ہے
پاتال بھی جس کی نہیں ہے
وُہ گہراؤ جو خُود خواہش ہے
جس کی اِشتہا......
اب کیا بتائیں
کس قدر بے اَنت اُس کی اِشتہا ہے!

☆☆☆

نار، ہوا اور ناری

نار، ہوا اور ناری
تینوں سکھیاں ہیں
اِک دُوجی سے مِل نہ سکیں تو
دیکھتے دیکھتے
سُنبل ایسے کومل خوابوں
کے تکیوں پر
سر رکھ کر وہ سو جاتی ہیں
جاگ پڑیں اور مل بیٹھیں

تو آگ کی رَوشن کلیوں میں
ڈھلتی جاتی ہیں
اِک دُوجی کی حِدّت سے
کِھلتی جاتی ہیں
آخر آخر
ایک چِتا بن جاتی ہیں!

☆☆☆

پیپرویٹ

پیپرویٹ کے اندر جانے کون چھپا تھا
سُرخ گلاب کی پتّی سے بھی نازک تر
اور اَربوں کھربوں درجے چھوٹا اِک نقطہ
جو پیپرویٹ کے مجس سے
باہر لپکا تھا!

کہاں گیا وُہ؟
سب کہتے ہیں:

پیپر ویٹ پھٹا تو لاکھوں کرچیں
وقت کے گہرے ساگر پر
بُوندوں میں ڈھل کر
برس پڑی تھیں
ساگر میں تحلیل ہُوئی تھیں
لیکن وُہ نازک سی اِک کرچی سے چمٹا
اب تک ساگر کے سینے پر رُکا کھڑا ہے'
مجھے پتا ہے
آخر اِک دن یہ کرچی بھی
وقت کے گہرے ساگر کی
بے اَنت تہوں میں جا بیٹھے گی
تب وُہ نقطہ
جس کا اپنا شیشے کا گھر
ریزہ ریزہ ہو کر ہر سُو بکھر چُکا ہے
تم ہی بتاؤ
کس دَر پر وُہ دستک دے گا
کس گھر کا آسیب بنے گا ؟

☆☆☆

شام، اِک سُرخ کِھلونا

شام، اِک سُرخ کِھلونا جس پر
سارے بچّے
ٹُوٹ گرے تھے!

رات، وہ کالی بُڑھیا جس نے
سُرخ کِھلونا
بچّوں کے نازک ہاتھوں سے
جھپٹ لیا تھا

دُور اُفق کے پار
سیہ ساگر کے اندر پھینک دیا تھا!

اب وُہ کتنے
چاندی کے خُود کار کھلونے
گڑیاں، چڑیاں، گُھگّو گھوڑے
بچّوں کو دینے آئی ہے
پر بچّے تو چیخ چیخ کر
وہی پُرانا سُرخ کِھلونا مانگ رہے ہیں
اُن کی پلکوں اور گالوں پر
شبنم ایسے
کتنے ہی بے داغ کِھلونے
رُکے کھڑے ہیں!!

☆☆☆

شام کے ستارے سے......

شام کے سِتارے سے
رات کے اندھیرے تک
فاصِلہ ہی کتنا ہے !

چاندنی کی برکھا سے
کوندتے سویرے تک
راستہ ہی کتنا ہے !

سانس کے اُکھڑنے سے
آخری بسیرے تک
مرحلہ ہی کتنا ہے !

ابتدا بھی تاریکی
اِنتہا بھی تاریکی
درمیان دونوں کے
بُوند بھر سویرا ہے !!

☆☆☆

دُکھ خیمے میں رہتی ہے!

دُکھ
آنکھوں کے خیمے میں
نہ جانے کب سے رہتی ہے
کبھی خاموش بیٹھی
کوئلوں کی راکھ میں کچھ ڈھونڈتی ہے
کبھی خیمے کے دَر پر جا کھڑی ہوتی ہے
اور اُس چاپ کو سُنتی ہے
جو اُس کے ہراساں دل کے پنجرے میں

مقید ہے
کبھی جب خُود کو
اپنی آنے والی تُندخُونسلوں کی
شَریانوں میں بہتے دیکھتی ہے
تو ٹھنڈی سانس بھرتی ہے
تو آنسو بن کے گرتی ہے
مگر کچھ کر نہیں سکتی
مگر کچھ کر نہیں سکتی !

☆☆☆

اِک زخمی منظر

سُوکھے کی مت بات کرو اَب
دیکھو کیسے بانکے تیکھے رنگوں کی برسات میں
ہر شے بھیگ گئی ہے
آنکھوں میں کاجل پھیلا ہے
اَور شفق کے پیڑ سے
کتنے سُرخ، سنہری، سبز پرندے
پھُولوں کے پیلے ہاتھوں پر
آ بیٹھے ہیں!

دل ......اِک دشت کہ جس میں
سُندر موسم آنا بھُول گئے تھے
اب اِس دشت میں
کیسے کیسے پیارے موسم
اَبر کے رنگیں کپڑے پہنے
چاروں جانب گھوم رہے ہیں !

سُوکھے کی مت بات کرو تُم
مت یہ کہو تُم :
وُہ اِک بھُورا سُوکھا موسم
جس نے اپنے تن پر
ریت بھبُوت مَلا تھا
اِک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھا
اپنے قاتل پنجوں
بھاری پنکھوں کو سینے سے بھینچے
آج بھی اِک زخمی منظر کا
خواب سُہانا دیکھ رہا ہَے !!

☆☆☆

بگھّی

جانے کب سے
اِک چھوٹی سی خاکی بگھّی
کھڑ کھڑ کرتی، جھٹکے کھاتی
گولائی کی
لاکھوں برس پُرانی
اِک خستہ سی گَیل[1] کے اندر
گھوم رہی ہے،
اور ہم اُس کے اُوپر بیٹھے

اُونگھ رہے ہیں!
اِس بگھی کے
گِھسے پِٹے جُثّے سے نکلتی
ٹھنڈی آہیں
گرم کراہیں
ہم عاجِز کب سُن سکتے ہیں!
ڈولتے پہیوں کے چلنے کا
دہشت ناک تماشا
کیسے دیکھیں
ہم پہیوں کو دیکھ کہاں سکتے ہیں!

☆☆☆

ا۔ گاؤں کے کچے راستے پر بیل گاڑیوں سے پڑی گہری لکیر

دُکھ

ہمیں خبر ہے
دُکھ، مُردار پہاڑ کے چوڑے سینے سے چمٹے
اُس پتھر کو
بس ایک ہی وار میں
ریزہ ریزہ کر سکتا ہے
جس سے تم نے
صدیوں پہلے

کیسے کیسے رَوشن پیکرِ خلق کیے تھے!

ہمیں خبر ہے
دُکھ کے رُوپ ہزاروں ہیں
کبھی فلک کو چُھونے والی
کسی عمارت کے اندر وُہ
گہری کالی دُھند کا بھاری چوغہ پہنے
زینہ زینہ نیچے ہی نیچے کو جاتا
دِکھتا ہے
کبھی وُہ جلتا بُجھتا
ایک بھیانک منظر بن کر
اُوپر ہی اُوپر کو اُٹھنے لگتا ہے!

کبھی فلک پر
پنچھی بَن کر
پل بھر رُک کر
اپنا آپ دِکھاتا ہے
کبھی وہیں آنسو کی جھیل میں

جَست لگا کر
جانے کیا کچھ لے آتا ہے!

تم کہتے ہو
دُکھ خواہش کی کوکھ سے
پیدا ہوتا ہے
ہم کیا جانیں
ہمیں تو بس اِتنا ہی پتا ہے
ہم، خواہش کی قاشیں
دُکھ کا بھوجن ہیں
ہم، دُکھ کے دسترخوان پہ سجتی رہتی ہیں!!

☆☆☆

آنکھ کُھلی تو مَیں نے دیکھا

آنکھ کُھلی تو مَیں نے دیکھا
مَیں پُروا کا اِک جھونکا تھا
پیپل کے نٹ کھٹ پتّوں کو چھیڑ رہا تھا'
تالی کی آواز سے ڈر کر
شاخوں سے اُڑتی چڑیوں پر
بِن سوچے ہنستا جاتا تھا!

پھر دیکھا تو جھونکا

ایک بگولا بن کر
شرمیلی خوشیوں کے
چکّر کاٹ رہا تھا!

دیکھتے دیکھتے
تیز بگولے کا رُخ جیسے
اندر کی جانب کو مُڑا تھا
اَور بگولا
اِک سرکش گرداب کی صُورت
اپنی واحد آنکھ کے اندر
اُتر گیا تھا!

آج مگر مَیں
اندر کی تہہ دار مَسافت طے کر کے
بالآخر
اپنی آنکھ سے باہر ٹپک پڑا ہُوں
باہر کے بے اَنت جہاں کے گِرد
بڑی تیزی سے جیسے گھُوم گیا ہُوں

یُوں لگتا ہے
کسی عظیم طَواف کا دھارا بَن کر
مجھ آنسو نے
اِس برہمانڈ[1] کو گھیر لیا ہے !!

☆☆☆

[1] Cosmic Egg

کبھی آسماں ایک صحرا تھا!

کبھی
آسماں ایک صحرا تھا
سمتوں، زمانوں سے آزاد
سویا پڑا تھا
مگر آج...... کوئی بتاؤ،
اُسے کیا ہُوا ہے؟
کہ وُہ کترنوں، دھجیوں، خُون آلود پنجوں میں
بٹ کر

سیہ رنگ میخوں میں ڈھل کر
زمیں پر اُترنے لگا ہے
زمیں، اُس کے بھاری پَروں کے تلے
دم بخُود
خوف سے کانپتی
اپنے اندر ہی اندر
سمٹتی چلی جارہی ہے!

☆☆☆

‹ ›

بھیگی رُت میں......

بھیگی رُت میں
شبنم کی فیاضی دیکھو
پھُول اور پات تو ایک طرف
وُہ کانٹوں سے بھی پیار......
مگر یہ کانٹوں والا پیار تو
بس چھن بھر کا پیار ہی ہوتا ہے
پیار تو برق کا اِک دھارا ہے
جس نے زمیں کی کوکھ میں بہنا سیکھا ہے

وُہ کب خار کی نوک پہ
اِک جوکر کی صُورت
سَر پر کُبڑا ٹوپ جما کر
اپنی بھینگی آنکھ دِکھا کر
سب کو کھِڑ کھِڑ ہنسنے کے
آداب سکھاتا ہے،
پیار تو شیر کے مُنہ میں
اپنا بازُو ڈال کے
سب آنکھوں میں
دُکھ اوِر خوف کی اِک بھیگی دُھندلاہٹ
بھرنے آتا ہَے،
دیکھنے والوں کے سینے میں
پھیلتا جاتا ہَے!

☆☆☆

وقت ٹھہرا ہُوا ہے!

زماں کی روانی فقط واہمہ ہے
زماں ...... گول منکوں کا اِک ڈھیر جس کو
مری اُنگلیاں رات دن گِن رہی ہیں!
مری اُنگلیوں کو پتا ہے
کہ ہر گول منکا
جو بے حِس پڑا ہے
فقط ایک پَل ہے کہ جس کی
ازل بھی نہیں

اور اَبد بھی نہیں ہے
مگر دیکھنے والے کہتے ہیں :
منکے رواں ہیں
مِری اُنگلیوں سے گزرتے چلے جا رہے ہیں !

زماں کی روانی فقط واہمہ ہے
ہر اِک شے
خود اپنی جگہ پر
حنُوطی ہُوئی لاش ہے
وقت کی منجمد قاش ہے
وقت ٹھہرا ہُوا ہے !!

☆☆☆

برسوں پہلے

برسوں پہلے
اُس کے چِھن جانے کا خدشہ
تیز نکیلا انکھوا بن کر پھُوٹ پڑا تھا
اور میں خوف کے پنجے میں محبُوس ہُوا تھا
پر، پھر مَیں
پنجے کی سخت سُلاخوں سے
آزادی پا کر
چڑیوں، قازوں

اوِر بادل کے چڑتے پھِرتے گلّوں
کا اِک انگ بنا تھا
برسوں اُن کے سنگ پھِرا تھا!

آج مگر آکاش کو اُن سے
خالی پا کر
اپنے گھر جب لَوٹا ہُوں
تو دیکھتا ہُوں
وُہ خدشہ ایک بھیانک
پیڑ کی صُورت
میرے گھر کو ڈھانپ چُکا ہے
گھر اُس کی مُٹھّی میں جکڑا
تھَر تھَر، تھَر تھَر، کانپ رہا ہے!!

☆☆☆

اگر جی میں آئے......!

تمھارے لیے
اِک سمندر خریدا ہے، ہم نے
اِسے پاس رکھ لو،
اگر جی میں آئے تو اِک
گھونٹ میں اِس کو خالی کرو،
اور ازل سے ابد تک
سَرابوں میں لپٹی ہوئی سرزمیں
بن کے

آنکھوں کو ٹھنڈک سے سرشار کرتی رہو!
اگر جی نہ مانے
تو اَشکوں کے سکّوں میں ڈھالو اِسے
اَور لاکھوں کروڑوں
سیہ، سبز آنکھوں میں تقسیم کر کے
اُسی بے نَوا چُپ کے اندر چلی جاؤ
جس کی بجھی کوٹھری میں
ہزاروں برس سے
پھٹے، زرد، مانجھے[1] کے کپڑوں میں
لپٹی ہُوئی تم پڑی ہو!!

☆☆☆

[1] مایوں

چوٹی پر سے

آج
پہاڑ کی چوٹی پر وُہ پہنچ گیا ہے
چاروں جانب
ایک عَمُودی گہرائی ہے
جس کو طے کرنے میں
اُس کو پُورے اسّی برس لگے ہیں
گہرائی، کِھسیانی ہو کر
اُس کو اَیسے دیکھ رہی ہے

جیسے وُہ اِک پنچھی تھا جو
تھکے پَروں کے ساتھ اُڑا تھا
اوِروُہ اُس کے پیچھے خُونیں جستیں بھرتی
دوڑ پڑی تھی!

کتنی اُونچی چوٹی پر وُہ آ پہنچا ہے
جس سے آگے
نیلم سا آکاش کھلا ہے
جس کے کلَس کا پگھلا سونا
دمک اُٹھا ہے
آزادی کا ایک سُہانا موسم اُس پر
سونے کی بُوندوں کی صُورت
برس پڑا ہے
ایک عجیب سُکون اُسے محسوس ہُوا ہے
جیسے اپنے اندر کی اندھی کھائی کو
جُل دے کر وُہ بچ نکلا ہو!!

☆☆☆

اَپ اینڈ ڈاؤن

فلک سے سیڑھیاں اُتری ہُوئی ہیں
زمیں سے آسماں کو جانے والے
منتظر بیٹھے ہیں، کب
آواز آئے
اَور وُہ اپنے مقدر میں لکھی
سیڑھی پہ جھپٹیں
آسماں کی سمت اُوپر کو اُٹھیں
اُوپر ہی اُوپر

اَن گِنت پردے ہٹاتے
دُوریوں تک جُھولتے جائیں!

سُنو، اِن جانے والوں کی
اُڑانوں میں ابھی کچھ دیر باقی ہے
تو آؤ اِن سے کہتے ہیں:
تم اپنے من کے سُونے پن کے اندر
جھانک کر دیکھو
عجب کیا ہے، تمھیں صدیوں پُرانی سیڑھیاں
تیار مِل جائیں
جو بَل کھاتی
سیہ پاتال کے اندر ہی اندر
میخ سی بن کر اُترتی ہیں
سیہ پاتال......جس کے پار کی ریکھا
کسی نے آج تک دیکھی نہیں ہے!!

☆☆☆

شام سے کہہ دو!

شام سے کہہ دو
ہم بیمار ہُوئے تھے لیکن
اب بیمار نہیں ہیں
اب تو یُوں دِکھتا ہے جیسے
باتیں، سپنے، بادل، پتّے
جاگ اُٹھے ہوں
سب کے پنکھ نکل آئے ہوں

سب نے اُڑنا سیکھ لیا ہو!

شام سے کہہ دو
تم نے اگر رنگوں سے اُڑنا'
پنکھ ہلانا' سیکھ لیا ہے
میرے پیچھے پیچھے آنا سیکھ لیا ہے
جس کا تُم نے ابھی ابھی اِقرار کیا ہے
تو پھر آنکھیں کیوں بھیگی ہیں
کیوں اِتنی مغموم ہُوئی ہو
بل کھاتے اِس رنگوں کے کُہرام میں تُم
کیوں رُکی کھڑی ہو؟

☆☆☆

کیسے نادان ہو تم!

کیسے نادان ہو تم
روشنی بیچتے پھرتے ہو بُجھی گلیوں میں
اِن لوگوں کو
جن کی آنکھوں کی ضیا
چھین کے تم دُور کہیں بھاگے تھے
آج تم لَوٹ کے آئے ہو
تو یہ لوگ تمھیں دیکھ نہیں سکتے ہیں
تم کو پہچان کہاں پائیں گے!

روشنی، اِن کی ضرورت تھی کبھی
اب کہاں اِن کو طلب ہے اِس کی
روشنی بیچتے پھرتے ہو
تو اِس بات کو کیوں بھولتے ہو
روشنی...... دیکھنے والوں کی ضرورت ہوگی
کورآنکھوں کو بھلا
اِس کی ضرورت کیا ہے
کورآنکھوں میں تو
بے اَنت سُفیدی کی فروزاں لہریں
سلوٹیں بن کے بچھی ہوتی ہیں!!

☆☆☆

فِراق

کیا ہُوئے
وہ سُرمئی ایّام جب
تُوہی تُو تھا ہر طرف
میں بھی تھا......لیکن کہاں!
جیسے کوئی خَم
گلابی پیرہن کی قوَس کا،
جیسے چھینٹا اَبر کا
آکاش کے گنبد پہ

اِک زخمی کبُوتر کی طرح!

یاد کر
وہ سُرمئی ایام جب
پیرہن
چادر کی صُورت تن گیا
اَبر، پانی میں ڈھلا
پھر اوک سے آکاش کی
نیچے گرا
اور جُدائی
میرے تیرے درمیاں
تلوار بن کر آگئی!!

☆☆☆

TITANIC

برف کا وُہ تودہ تھا' اُسے
کیا خطرہ تھا
پانی کو پانی سے کہاں خوف آتا ہے
لیکن میں ترشا ہُوا اِک پیکر تھا' مجھ کو
پانی سے ڈر لگتا تھا
میرے تن کے اندر کہیں شِگاف پڑا تھا
برف کا تودہ
پانی کے اندر ہی اندر

میرے دِل کے پار ہُوا تھا
موجیں، میری بنیادوں پر ٹوٹ پڑی تھیں
اِک اندھا کُہرام مچا تھا
لیکن میرے عرشے سے چمٹی خوشیوں کو
خبر نہیں تھی
کچھ بھی اُنھیں معلوم نہیں تھا!

☆☆☆

کتنا بڑا یہ دروازہ ہے!

کتنا بڑا یہ دروازہ ہے
جس سے ہر پَل ایک ہُجوم گزرتا ہے
آنے والوں کے چہروں پر
لہُو کی لَو رَوشن ہوتی ہے
جانے والوں کی آنکھوں میں
خالی پن روتا پھرتا ہے!

کتنا بڑا یہ دروازہ ہے

جس کے پَٹ نوُری سالوں کی
کڑی مَسافت کے زرتار کناروں
سے چمٹے ہیں
اوِر دہلیز تو جیسے
ازل ابد کے پلّو تھامے
اِستادہ ہے!

کتنا بڑا یہ دروازہ ہے
جس کو طُول اوِر عرض سے
کچھ بھی غرض نہیں ہے
جس کو آنے والوں اوِر پھر
لَوٹ کے جانے والوں سے کیا لینا ہے
آنے جانے والے تو بس جھونکے ہیں
جو دروازے کے پَٹ پر دستک دے کر
آگے بڑھ جاتے ہیں!!

اگر دو ایک پل رُک کر!

تمھیں جانا تھا‘ یہ ہم جانتے تھے
مگر دو ایک پل رُک کر اگر جاتے
تو کیا جاتا
ہَوا کا لمس
شبنم کا لرزتا خَم
کلی کا اَدھ کِھلا پیکر
نمی کی نرم رَو خوشبو
یہ سب‘ وحشت کے عالَم میں

تمھاری سمت دوڑے تھے
مگر تم کو نہ جانے کیسی عجلت تھی
پہاڑوں کے بُلاوے پر
اچانک پار جانے کی......

تمھیں جانا تھا، یہ ہم جانتے تھے
مگر دو ایک پل رُک کر اگر جاتے
تو ہم سب
ہم سفَر بننے کی خاطر
تمھارے پاس، چھِن بھر میں
پہنچنے ہی کو تھے[1]!

☆☆☆

[1] غلام الثقلین نقوی کی یاد میں

آنسو بھری مُسکان

بس اِک
آنسو بھری مُسکان ہے
جس کے سہارے جی رہے ہیں
وگرنہ چھت پہ کنکر بھی گرے
تو اِک دھماکہ
سارے تن کو کپکپی کا دان دیتا ہے!
سحَر دم' دُودھیا اَخبار کے پرتوں
کے ٹکرانے سے
خبریں' پتّیاں بن بن کے گرتی ہیں
"تبرک" مُٹھیوں میں بھر کے
خالی جھولیوں میں دَم بہ دَم
تقسیم کرتی ہیں
ہَوا جھونکوں میں بٹ کر
شہر کی گلیوں میں
ہم کو ڈُھونڈنے نکلی ہُوئی ہے
مقفل کھڑکیوں پر دستکیں دیتی
ہماری کھوج میں پاگل ہُوئی ہے
نہ جانے کس جگہ ہم آگئے ہیں
جہاں خوشیاں
زدِ جارُوب کھاتی پھر رہی ہیں!
بس اِک آنسو بھری مُسکان ہے
جس کے سہارے جی رہے ہیں!!

Address of the Author:
115/3 Sarwar Road
Lahore Cant., Pakistan

Contact No:
+92.42.6676378

ISBN 969-8527-33-8